باب نہم

رُودادِ ابتلاء : احمد رائف مصری

(۱۰)

جناب خلیل الحامدی صاحب

سٹور نمبر ۶ کی دُنیا

یہ سٹور ایک کمرے پر مشتمل ہے جو پہلی منزل میں جیل کے بڑے آہنی دروازے میں داخل ہوتے وقت دائیں جانب آتا ہے۔ اس کے سامنے پانی کا کنواں ہے۔ اس کی ایک کھڑکی "بڑی جیل" کی بیرونی سمت کھلتی ہے جہاں فوجی جیل کا بڑا پارک ہے۔ اس حجرے کے عین مقابل اسپتال واقع ہے۔ سامنے دُور، جہاں راستہ بند ہو رہا ہے۔ دفاترِ تفتیش کی عمارت واقع ہے۔

یہ کمرہ دس سے زیادہ افراد کی گنجائش نہیں رکھتا۔ اور یہ بڑی تعداد جو اس کے اندر بھر دی گئی ہے بڑی تنگی سے رہ رہی ہے۔ صبح جب سورج نے اپنی کرنیں ڈالیں اور ہم نے اس کمرے میں موجود لوگوں کو گن کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان کی تعداد پینتالیس ہے۔ حالانکہ اس کمرے کا جسے سٹور نمبر ۶ کہا جاتا ہے، پورا رقبہ ۲ + ۳ میٹر ہے۔ اور پیشاب، پاخانے اور پیپ کی بدبُو سے بھر رہا ہے۔ دبی دبی اور گھٹی گھٹی آہیں اُٹھ رہی ہیں۔ کیونکہ ہدایات یہ ہیں کہ قطعاً کوئی آواز بلند نہ ہو۔ ورنہ یہ سگانِ گرسنہ جنہیں زخموں سے اُٹھنے والی بُو بڑی کشش کر رہی ہے کمرے میں داخل ہو جائیں گے۔ یہاں یہ خیال رہے کہ ہم جب اسٹور میں داخل ہوئے تو ہم میں سے ایک بھی ایسا فرد نہ تھا جو مجروح نہ ہو چکا ہو اور اس کے زخموں سے مسلسل خون نہ بہہ رہا ہو۔ جزع و فزع کے عالم میں ہمیں اسٹور میں داخل کر دیا گیا، اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے اُوپر گرتے رہے۔ اور جو شخص جس حالت میں جہاں بیٹھ گیا سورج طلوع ہونے تک اُسی طرح پتھر بنا رہا۔ پہرہ داروں نے وارننگ دی تھی کہ وہ کوئی آواز یا کھڑکھڑاہٹ نہیں سُننا چاہتے۔ اور جو ایسا کرے گا اُس

کی سزا موت ہے۔ ہم جانتے تھے کہ اُن لوگوں کی دھمکیاں جھوٹ نہیں ہوتیں۔ بلکہ جو کہتے ہیں کر گذرتے ہیں۔

ہمارے ایک ساتھی نے اس سکوت کو توڑ ڈالا۔ اُس نے اپنا پیشاب روک رکھا تھا۔ وہ ہم سب میں سے بہت کم بیت الخلاء کی طرف جاتا تھا اور اب اُسے بیت الخلاء گئے ہوئے ۳۶ گھنٹے ہو رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ دروازے کے باہر ایک بدصورت دیونما سپاہی کا سایہ نظر آیا جس نے ہاتھ میں تازیانہ اُٹھا رکھا تھا۔ وہ گلا پھاڑ کر کہنے لگا: کیا کوئی شخص بیت الخلاء جانا چاہتا ہے۔ جواب میں ہم سب خاموش رہے۔ سپاہی نے نہایت فحش گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اور پھر وہی سوال دُہرایا۔ اندھیرا گھٹا ٹوپ تھا۔ لوگوں کے چہروں کے تاثرات بھانپنا مشکل تھا۔ لیکن قدرتی طور پر خوف ایک ایسی چیز تھی جو سب میں قدر مشترک تھی۔ ہمارے ساتھی کا کچھ حوصلہ بڑھا۔ اور اس نے بیت الخلا جانے کی درخواست کی۔ ہمارا یہ نظر بند ساتھی مصری فوج میں جرنیل کے عہدہ پہ فائز تھا۔ اس زشت رُو سپاہی نے اُسے باہر نکالا۔ اور وہ ہم قفسوں کے اُوپر سے گزرتا ہوا دروازے سے باہر آیا۔ دروازے کے باہر بجلی کی نہایت مدھم روشنی کے اندر سپاہی نے اس عظیم فوجی افسر کو یکایک مارنا شروع کر دیا۔ اور بہت بُری طرح اُسے مارا۔ اس کے بعد کتے آئے اور ہماری آنکھوں کے سامنے اُس کے جسم کے بعض حصّوں سے گوشت نوچنے لگے۔ یہ سزا دینے کے باوجود اُس بےچارے کو انہوں نے کنوئیں میں پھینک دیا۔ جب وہ مرنے لگا تو کنوئیں سے نکال کر کمرے کے اندر دھکیل دیا۔ خون اور پانی کے قطرے اس کے جسم سے ٹپک رہے تھے۔ اس حال میں اُسے کانپتا ہوا چھوڑ گئے، اور کچھ عرصہ کے بعد اس کے کپڑے تو خشک ہو گئے مگر خون نہ خشک ہو سکا۔ یہ "درس" اُسے اس لیے دیا گیا کہ وہ آئندہ بیت الخلاء کا رُخ کرنے سے بےنیاز ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے اپنی جگہ پر ہی پیشاب بھی کیا اور پاخانہ بھی۔ اُس کی بُو سے قریب بیٹھنے والے انسانوں کی ناک میں دم ہو گیا۔ میں بھی اُن میں شامل تھا۔ یہ معاملہ دیکھ کر ہر شخص دم بخود اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اور اپنے افکار و آلام میں کھویا رہا۔ نہ کہیں کوئی سرگوشی ہوتی اور نہ سانس کی آواز سنائی دیتی۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد دروازہ کھولا جاتا اور ایک نیا نظر بند ہمارے اُوپر لا کر پھینک دیا جاتا۔ انسانوں کو یہاں لا کر اسی طرح بے دیکھے بھالے پھینکا جاتا جیسے وہ انسان نہ تھے بلکہ آلوؤں کی بوریاں تھے۔ یہ نئے لوگ یا تو تحقیقات کے مرحلے سے گذر کر یہاں آ رہے تھے یا گھروں سے پکڑ کر سیدھا اس جگہ انہیں پہنچایا جا رہا تھا۔ ایک ہنگامۂ دار و گیر اور غلغلۂ رستاخیز بپا تھا۔

تاریکی شدید تھی۔ ہم چہرے سے کسی کو شناخت نہ کر سکتے تھے۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ تاریکی کے اندر کچھ

ہاتھ اُٹھ رہے ہیں اور اس ڈر سے کہ کہیں سپاہی سخت گیری پر نہ آ جائیں زخمی ساتھیوں کے موہنوں سے اُٹھنے والی ہلکی ہلکی دلگداز آہوں کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم بھوک سے تڑپ رہے تھے اور پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ لیکن خوف کے سامنے بھوک اور پیاس کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے، ایسا خوف جو سینوں میں سے دلوں کو چیر چیر کر نکال رہا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد ایک شخص نے دبی دبی آواز سے کہا: "بھائیو" یہ لفظ اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ عظیم فوجی افسر جس کے بول و براز سے آلودہ کپڑوں سے حد درجہ تکلیف دہ بدبو اُٹھ رہی تھی، ایک دم بول اُٹھا: "تو کیا چاہتا ہے۔ کیا جس حالت میں ہم گرفتار ہیں کیا تمہاری نظر میں یہ کافی نہیں ہے"۔

لیکن وہی دبی ہوئی آواز پھر اُٹھی اور وہ شخص بااصرار کہنے لگا:

میں نے ایک نہایت ضروری چیز کا انکشاف کر لیا ہے۔۔

کونسا انکشاف؟

دروازے کی ایک جانب رکھے دو برتن پڑے ہیں۔

کیا مطلب؟

میرا خیال ہے کہ ان میں سے ایک برتن پیشاب کرنے کے لیے ہے اور دوسرا پانی پینے کے لیے۔ لیکن میں معیّن طور پر یہ نہیں جان سکا کہ کون سا پیشاب کے لیے اور کونسا پانی پینے کے لیے ہے۔

ہمارا ایک ساتھی یہ سن کر چپکے چپکے اُٹھا اور ایک برتن میں اُس نے پیشاب کیا اور دوسرے میں اُسے پیا۔ اس مبارک رات کو میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ پیشاب پیا۔ پیاس سے نڈھال انسان جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ چارہ جوئی کرتا ہے۔ مگر کیا پیشاب پینا کوئی آسان بات ہے؟ یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ رات ایسی شدید و پُرہول تھی کہ ہمارا کوئی ساتھی بھی قطعاً نہ سو سکا۔ اس کے بعد اور بھی ایسی متعدد راتوں سے واسطہ پیش آیا۔ ہم جس درد و آزار سے دوچار تھے اُس کی وجہ سے ہم یہ کم ہی سوچ پاتے تھے کہ جب ہمیں اچانک تحقیقات کے لیے بلایا جائے گا وہاں ہم کیا جواب دیں گے یا کیا موقف اختیار کریں گے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مجھے تحقیقات کا سامنا کرنے کے لیے چالیس روز سے زیادہ عرصہ تک انتظار کرنا پڑا۔ ابو زعبل کی تحقیقات اور فوجی جیل کی تحقیقات میں زبردست فرق پایا۔ فوجی جیل کے اندر تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ تازیانوں سے یا لوہے کی گرم گرم سلاخوں سے داغ کر نظربند کو مار ڈالا جائے، اُس کے ناخن اُکھاڑ دیے جائیں، کتوں سے اس کی تِکّا بوٹی کرا دی جائے، اُسے بجلی کے جھٹکے دیے جائیں، فوجی بوٹوں سے

اُسے ٹھوکریں مار مار کر بے جان کر دیا جائے ــــ

رات اپنی ہولناک فضا اور دلگداز تاریکی میں ڈوب رہی تھی۔ اسی دوران دروازہ کھلا اور دو مزید انسان کمرے میں لاکر پھینک دیے گئے۔ اس کے بعد ایک شخص کا نام پکارا گیا۔ مطلوبہ شخص خوف کے مارے کانپتا ہوا اُٹھا۔ اس پر اس قدر لرزہ طاری ہو گیا کہ اُس کے دانتوں کے بجنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ تاریکی کے اندر میں نے اُسے نگاہیں جماکر دیکھا۔ باہر گراؤنڈ سے آنے والی مدہم روشنی دروازے کو چھو رہی تھی۔ جب وہ شخص دروازے میں سے گزرا تو میں نے اُسے پہچان لیا، یہ وہی مسکین فوجی افسر تھا جو رات کی زدوکوب کے اثرات سے ابھی تک آرام نہ کر پایا تھا۔ اُسے پھر تحقیق کے لیے طلب کر لیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ سٹور کے اندر جتنے انسان محبوس تھے وہ میری اس عاجزانہ دُعا میں شریک تھے کہ یہ درماندہ فوجی افسر اب نمعلوم کس انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔ خدا اس کی مصیبت کو آسان فرمائے۔

سپیدۂ صبح کے پہلے ہی دھارے نمودار ہوئے تو ہم میں سے ہر شخص نے اپنے ساتھی کا چہرہ دیکھا ــ اتنے میں دروازہ کھلا اور چار دیونما سپاہی مذکورہ بالا عظیم افسر کو ہاتھوں پہ اُٹھائے اندر داخل ہوئے۔ تازیانوں کی ضربوں سے اُس کے بدن کی دھجیاں اُڑ چکی تھیں۔ کتّے اُس کے جسم کو پیٹ بھر کر نوچ چکے تھے۔ سپاہیوں نے اُسے یکایک ہمارے اوپر لاکر ڈال دیا۔ اس کے گرنے کی آواز یوں آئی جیسے گھاس کی گٹھڑی لاکر پھینک دی گئی ہو۔ ہم میں سے کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ اُسے چھوئے یا اس کے الم کو ہلکا کرے جو اُس کی گھٹی گھٹی دل گداز آہوں اور اُس کے خون میں لت پت کپڑوں سے عیاں ہو رہا تھا۔ ہمارے لیے یہ پتہ لگانا بھی مشکل تھا کہ خون کا کونسا دھارا کس جگہ سے بہہ رہا ہے۔ وہ سراپا زخم تھا، گہرے زخم۔ ہر حصّے سے خون بہہ رہا تھا۔ سورج کی کرنیں پھوٹیں تو اس عظیم فوجی افسر نے یکبارگی آنکھیں کھولیں اور اُس نے دُنیا پہ ایک نگاہ واپسیں ڈالی اور پھر ایک زور سے چیخ ماری۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا جیل کا گوشہ گوشہ کانپ گیا ہو۔ اس چیخ کے ساتھ ہی وہ ابدی نیند سو گیا۔

اس گراں بار اور ظلمت آمیز رات کی جو تفصیلات بعد میں ہمیں ملیں اُن سے معلوم ہوا کہ اس رات دو انسانی جانیں ضائع ہوئیں اور چالیس انسان بُری طرح زخمی ہوئے۔

کچھ سپاہی آئے اور انھوں نے مسکین فوجی افسر کی لاش ایک اُونی کمبل میں لپیٹ دی اور اُسے کسی ایسے مقام پہ لے گئے جسے کوئی شخص نہیں جانتا۔ اب قیامت ہی کے روز وہ اُٹھ کر اپنے ظلم کے انکشافات کرے گا۔

دن طلوع ہوگیا۔ سورج چمک اُٹھا۔ اور آلات تعذیب کی جھنکار شروع ہوگئی۔ میں آپ سے یہ بات چھپا کر نہیں رکھتا کہ رات جو لوگ مُلکِ عدم کو سدھار گئے تھے، اُن میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی کسی شخص نے حزن و ملال کا اظہار نہیں کیا۔ ہم میں سے کسی انسان کے دل میں غم و اندوہ کے لیے کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ ہمارا بال بال درد اور خوف میں گُتھا ہوا تھا۔ بلکہ ہم لوگ اُن انسانوں پر رشک کرتے تھے جو عذاب سے نجات پاکر درجۂ شہادت پا لیتے اور خدا کے حضور میں "سرخ رُو" ہو کر حاضر ہو جاتے۔

اسٹور کا دروازہ کچھ نیم وا ہوا۔ اور مجھے اپنی اُن آنکھوں کی مدد سے جیل کا صحن جھانکنے کا موقع مل گیا جو رات کی شدید گرمی کے اندر بے خوابی، درد اور پیشاب کے بخارات کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ مگر ان بوجھل آنکھوں نے ایسا منظر دیکھا جسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔

سپاہیوں کا ایک جتھا ایک ضعیف العمر انسان پہ کوڑے سے کر ٹوٹا پڑ رہا ہے اور اُسے بُری طرح مار رہا ہے۔ بوڑھا چیخیں مار رہا ہے اور دہائی پہ دہائی دے رہا ہے۔ اور ہر مرتبہ دہائی کے جواب میں اُس کے لاغر اور کھوکھلے جسم پہ آتش بار کوڑوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی ہے۔ رحم کی بھیک مانگتے مانگتے اُس کی گھگھی بندھ چکی تھی اور آخر کار وہ خاموش ہوگیا اور اُس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔ میں یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اُس کے ہاتھ آسمان کی طرف نالہ و فریاد کے لیے اُٹھے تھے یا دُعا و التجا کے لیے۔

سامنے کی دیوار پہ آبی رنگوں سے بنی ہوئی دو تصویریں منقش تھیں۔ ایک جمال عبدالناصر کی تصویر اور دوسری عبدالحکیم کی تصویر۔ یہ تصویریں کسی آرٹسٹ کا فن نہ تھیں۔ بلکہ ویسی ہی تھیں جیسا پہلی جماعت کے بچے بناتے ہیں۔ ان کے اوپر جلی حروف میں یہ مقولہ درج تھا۔ "میں بھوکوں کو دھوکا دیتا رہتا ہوں تاکہ میں حسبِ منشا زندگی بسر کرسکوں" معلوم نہیں یہ مقولہ کسی شوریدہ سر نے یہاں درج کر دیا یا اس کا نقاش کوئی میرے جیسا بدنصیب انسان تھا یا کوئی جلاد۔

میں محسوس کرتا تھا کہ میری رُوح کسی بھیانک کابوس کے اندر اُتر چکی ہے۔ میرے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے۔ میرے اندر اُس کے بارے میں سوچنے کا بھی یارا نہیں رہا۔ نیز یہاں کوئی ایسی دلیل بھی سامنے نہ تھی جو اس تمام عذاب و آزار کی وجہ جواز بن سکے۔ یہ بھیانک ڈرامہ کس شکل میں ختم ہوگا، اس کا تصور بھی میرے لیے محال تھا۔ ہر آنے والی گھڑی کا میں سو سو رنگ سے جائزہ لیتا۔ تعذیب کی چکی جو مجھے پیس رہی تھی، وہ محدود طاقت رکھنے والا انسان ہونے کی حیثیت سے برداشت سے باہر تھی۔ مگر ان حالات کے سامنے

مکمل سرافگندگی کے سوا اور کیا چارہ تھا ؎

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

کشاں کشاں میں اپنے دل سے کبیدگی اور مایوسی کے اثرات دُور کرنے میں کامیاب ہوگیا - میں نے اُن سچے اہل ایمان کو یاد کرنا شروع کر دیا جنہوں نے جان جوکھوں میں ڈال کر اسلام کی بنیاد رکھی تھی - اور اپنے اللہ سے انہوں نے جو پیمان باندھا تھا اُسے سچ کر دکھایا تھا (صدقوا ما عاهدوا الله عليه) - میں اپنے دل کی گہرائیوں سے دُعا کرتا کہ میں بھی اُن میں شامل کر لیا جاؤں، اور کسی چون وچرا اور نالہ وشیون کے بغیر یہ سنگین آزمائش جگر داری کے ساتھ بھگت لوں -

ایک ترش رُو، کج خُو اور بد زبان سپاہی اسٹور میں داخل ہوا - معلوم ہوا کہ اُس کا نام رُوبی ہے - اندر قدم رکھتے ہی رُوبی نے ہم پر فحش گالیوں کی بارش کر دی - ان میں سے چند گالیاں تو ہم سمجھ رہے تھے اور بعض سمجھنے سے قاصر تھے - البتہ ہمیں یہ یقین تھا کہ یہ انسان ہمیں بہت ہی گندی گالیاں دے رہا ہے - اُس نے اپنے ایک ہاتھ میں ایک غلیظ برتن اُٹھا رکھا تھا - چنانچہ اپنی غلاظت آلود انگلیوں سے اُس نے ہم میں سے ہر ایک کو طَعمیہ (مصر کا عوامی کھانا) کا ایک ایک ٹکڑا دینا شروع کر دیا - تقسیم کے دوران دو مرتبہ اُس نے اپنی ناک صاف کی اور اُسے اپنے سرکاری لباس کے ساتھ پونچھا - مجھے یاد ہے کہ اُسے دیکھ کر میرے دل میں کوئی کراہت پیدا نہیں ہوئی - جیسا کہ میں نے عرض کیا صورت حال کراہت کیا ہر چیز سے بالا و برتر ہو چکی تھی - طعمیہ تقسیم کرنے کے بعد اُس نے ہمارے سروں پر چند روٹیاں پھینک دیں اور واپس چلا گیا -

ہم نے روٹیاں گنیں تو وہ روٹیاں کیا تھیں چند ٹکڑے تھے جن کا مجموعہ صرف پانچ روٹیاں بنتی تھیں - جب کہ ہماری تعداد پچاس کے قریب تھی - ہر دس انسانوں کو ایک روٹی ملی اور وہ بھی شدید بھوک کے بعد - بایں ہمہ ہم میں سے بکثرت لوگوں نے اُسے کھانے سے انکار کر دیا - یہ انکار کسی احتجاج یا استکبار و تکبّر کی بنا پر نہ تھا بلکہ دہشت اور خوف اس قدر شدید تھا کہ ہم لوگ اس کے سامنے بھوک کے احساس سے محروم ہو چکے تھے -

کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی سپاہی رُوبی داخل ہوا اور ہمیں اسی طرح گالیوں سے نوازا جس طرح پہلے نوازا گیا تھا - اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں لوہے کی ایک لمبی سلاخ لے رکھی تھی اور بائیں ہاتھ میں پُرانے المونیم کا ایک ڈونگا جو کناروں تک چائے سے بھرا ہوا تھا - لوہے کی سلاخ سے اُس نے بعض ساتھیوں

کا سر زخمی کر دیا۔ اور جب وہ مار رہا تھا تو ڈونگے میں سے بہت سی چائے چھلک کر زمین پر گر گئی اور جو باقی بچی اُس کے بارے میں وہ پیشکش کے انداز میں اعلان کرنے لگا کہ " ڈونگے کے اندر باقی ماندہ چائے اسٹور نمبر ۶ کے اندر رہنے والے پچاس انسانوں میں تقسیم کر دی جائے "۔ اس مرتبہ ہم نے چائے پینے سے بھی انکار کر دیا۔ ہم ہر چیز کو ہیچ سمجھ رہے تھے۔ یہ چائے ظہر تک وہاں پڑی رہی۔ روبی کو پتہ چلا کہ ہم نے اُس کی چائے نہیں پی تو وہ غصے میں ڈوبا ہوا آیا اور اُس نے ہم سب کی گرم گرم ضربوں سے تواضع کر ڈالی۔

اُس کے جانے کے بعد ایک اور سپاہی آیا جو اپنے ساتھی سے بھی زیادہ کریہہ اور کرخت تھا۔ اُس نے یہ کہا کہ ہم بیت الخلا کی طرف نکلیں تاکہ ہم قضائے حاجت کر سکیں اور ہاتھ منہ دھو سکیں۔ نیز پیشاب کے بجائے ٹونٹی کا آبِ زُلال پئیں۔ ہمیں بیت الخلا کی طرف جانے کی بڑی خوشی ہوئی مگر خوشی پوری نہ ہو سکی ——— پہلی منزل میں بیت الخلا تھے۔ ہم اُن کی طرف دوڑ دوڑ کر چل دیے۔ راستے میں ہر طرف سے ہم پر کوڑے برستے یا کتے ہمیں کاٹتے۔ ہم میں سے ہر ایک شخص کو ایک ایک پاخانے کے اندر داخل کر دیا گیا۔ ہر پاخانہ کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ پوری جگہ بول و براز سے بھری ہوئی تھی۔ اور ستم یہ کہ اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے جب پاخانے کا دروازہ بند کر لیا اور قضائے حاجت کرنے لگا تو یک دم سپاہی نے دروازہ کھولا اور مجھے تازیانے مارنے لگا۔ میں سخت اُلجھن میں گرفتار ہو گیا اور یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ کالے رنگ کا چہرہ۔ دھنسی ہوئی آنکھیں۔ اُس کے مسوڑوں اور دانتوں کے اندر مدت دراز سے تعفن پیدا ہونے کی وجہ سے سڑانڈ بُری طرح پھوٹ رہی تھی۔ اور بدنما چہرے پر برص کے سفید سفید داغ چمک رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر مجھے ڈاروِن کی گمشدہ کڑی یاد آ گئی۔ بلکہ ناروے کا مشہور ادیب ابسن بھی تصور میں جھلک گیا۔ اُس نے اپنا کریہہ المنظر دہن وا کیا اور چنگھاڑ کر کہنے لگا۔

کتے کے بچے باہر نکل آ۔

بابو جی۔ ذرا رُکیے۔

خسیس، کمینے ..... کتے ..... میرے سامنے بولتے ہو۔

ان الفاظ کے ساتھ اُس کا کوڑا پوری شدت اور گرمجوشی کے ساتھ میری خبر لے رہا تھا۔ میں اسٹور کی طرف لوٹ آیا۔ تازیانے کی تند و تیز ضربوں کے سوا جن کے نشانات میرے منہ، کندھوں اور پشت پر آج تک نقش ہیں

بیت الخلاء جانے سے مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ میں نے دوسرے ساتھیوں کو دیکھا کہ وہ بھی بدحواس چوہوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے، اور سپاہی جانوروں کی طرح اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ اس گھٹی فضا کے اندر تازیانے گونج رہے تھے یا کتے بھونک رہے تھے۔

تازیانوں کی آگ نے بیسیوں انسانی جسموں کو بھون دیا۔ میں ان سوختہ جسموں کے درمیان غیظ و غضب کے جذبات میں ڈوبا ہوا ڈھیر بنا پڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص بھی رفع حاجت نہ کر سکا۔ تمام چہرے گہرے سکوت میں ڈوب چکے تھے اور اُن پر سیاہی چھا رہی تھی۔ ایک شخص نے جھنجھلا کر ہاتھ اُٹھایا اور خود فراموشی کے عالم میں رو کر کہنے لگا: "یہ ظلم ہے"۔ "یہ ظلم ہے"۔ یہ سن کر نظربندوں میں سے ایک صاحب جو ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور اُن کے بالوں کی سفیدی بتا رہی تھی کہ بڑے جہاندیدہ اور تجربہ کار ہیں، بولے: "ہم سب جانتے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے۔ آپ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں۔ ایسا کوئی لفظ زبان سے نہ نکالیں۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ آج ہم میں سے کس کی موت آ رہی ہے"۔ یہ "دانشورانہ" نصیحت سن کر اسٹور پر ہمہ گیر خاموشی کا پردہ تن گیا۔ اس پردے کو اگر کوئی چیز چاک کرتی تھی تو وہ باہر سے آنے والی تازیانوں کی گونج یا مظلوموں کی دبی دبی آہوں کی صدا تھی۔

ہم میں سے ہر شخص افکار کی دُنیا میں ڈوب گیا۔ میرے ذہن پر تو وہ ایک لفظ چھایا ہوا تھا جو قلعہ کی جیل میں مجھ سے سرکاری افسر نے کہا تھا، یعنی "خانگاہ والا شعبان"۔ اے شعبان تو کہاں ہے ― شعبان تیری وجہ سے میری ہلاکت ہونے والی ہے۔ تیرے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہیں اور میں تجھے نہیں جانتا۔ تجھ سے میری ناواقفیت میرے لیے پیغام موت بن رہی ہے۔ شعبان! کوڑوں کی بارش کے اندر موت ایک بہت ہی خوفناک بات ہے۔ شعبان! شاید اس گھڑی تیری پیٹھ پر بھی تازیانے برس رہے ہوں گے۔ کون ہے تو اور کہاں ہے تو اے شعبان خانگاہ کے رہنے والے"۔

(باقی)